فیض کی عصری حسیت

ڈاکٹر گلشن طارق
ڈین کلیہ السنہ
گیریژن یونیورسٹی، لاہور

CONTEMPORARINESS OF FAIZ

Gulshan Tariq, PhD
Dean of Languages
Garrison University, Lahore

Abstract

Renowned modern Urdu poet Faiz is also known as the poet of revolution though no revolution perpetrated. The voice of the oppressed and the deprived is found in his poetry. He finds more solace in expressing the miseries of the world than in delineating the pangs of physical love. This very concern for humanity raises him to the level of a global poet where his contemporaneous sensitivity transforms him into the poet of the present world. The article presents poetry of Faiz according to the modern perceptions in the light of his own poetry.

Keywords:

اقبال، فیض، شاعری، غزل، سماجی، معاشی، مارکسزم، عصری، لاہور، بمبئی

بیسویں صدی کا نصف اول دو عالمگیر جنگوں کی لپیٹ میں آگیا، یہ آگ و خون کی وہ ہولی تھی جس نے خوابوں کے محلوں کو چکنا چور کر دیا، اب روایتی شاعری کی خیال افروزی، خیال بن کر رہ گئی۔ زندگی کے تلخ حقائق سے آشنا ہو کر شعرا بھی حقیقتوں کا سامنا کرنے لگے۔ اقبال بھی محبوب سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی غزلوں سے باز آئے۔ انھوں نے داغ کے رنگ ”نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی؟“ والی غزل سے کنارہ کر لیا۔ وہ ملکی اور قومی مسائل سے نبرد آزما ہوئے۔ جوش نے انگریزی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ترقی پسند شعرا سامنے آئے۔ انھوں نے سماج اور ادب میں بغاوت کا آغاز کر دیا۔ وہ سماج میں طبقاتی نظام کو ختم کر کے ایک ایسا نظام رائج کرنا چاہتے تھے جو مساوات، انصاف، محبت اور اخوت پر مبنی ہو۔ ترقی پسند ادب میں محبت کے جذبے نے ایک انقلابی صورت اختیار کر لی۔ اس دور میں محبت کا جذبہ تمام تر جنسی رہا۔ اقبال نے اسے توانائی اور جوشِ حیات اور اختر شیرانی نے حسن پرستی کے مترادف قرار دیا جب کہ مجاز نے محبوب کے آنچل کو پرچم بنانے کے خیال کا اظہار کیا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض شعرا مثلاً راشد اور میرا جی کے یہاں عشق جنسی شکل میں سامنے آیا اور عشق کی جنسیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔

فیض کا مزاج رومانی تھا۔ ان کے یہاں وفور جذبات، حسن فطرت، حسن پرستی اور خواب آفرینی کا عمل ملتا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ رومانی رجحان سے وابستہ ہو کر اپنے جذبات و احساسات کو اہمیت دیتے رہے۔ نقش فریادی کی نظم ”انتہائے کار“ میں لکھتے ہیں:

ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا (۱)

لیکن جب خارجی حقائق پر ان کی نظر پڑی تو ان کی شاعری نے حقیقت نگاری کا نیا موڑ اختیار کیا۔

”میرے ندیم“

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں

وہ انتظار کی راتیں، طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں بانہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئیں ہیں، میرے ندیم (۲)

اس میں شک نہیں کہ فیض کی شاعری کا ابتدائی محرک تو وہی حادثۂ محبت نظر آتا ہے، جو اس عمر کے ساتھ اکثر منسوب و مخصوص ہوتا ہے۔ پھر اس دور میں کچھ سماجی اور معاشی آسودگی و بے فکری بھی تھی۔ اس کے علاوہ شاعری کی فضا حسرت، جوش، حفیظ اور اختر شیرانی کی آوازوں سے معطر تھی۔ ادب میں حُسن و عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ فیض کو حُسن و عشق نے ابھی آواز ہی دی تھی کہ اُن کے کانوں میں اقتصادی بحران، کساد بازاری، بے روزگاری اور افراطِ زر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل، گیا جب اپنا ہی جیوڑا نکل۔ والا معاملہ ہو گیا۔ کہاں یہ کہ فیض کہہ رہے تھے:

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کی ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

اور جب محروموں، بے نواؤں، بے کسوں اور محنت کش طبقے کی جانب داری اور اشترا کی نقطۂ نظر کی حمایت کے علاوہ کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو کہا:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

یہ حقیقت نگاری اشترا کی تحریک کی پروردہ ہے۔ یہ محنت کش طبقے کی جانب داری اور اشترا کی نقطۂ نظر کی حمایت کی حامل ہے۔

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے (۳)

یہ رنگ ان کی غزلوں میں بھی ملتا ہے:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے(۴)

فیض نے اشترا کی نظریات کے تحت انسان دوستی کے درد کو اپنایا اور اس کے اظہار کے لیے انھوں نے نہ تو حالی کے انداز بیان کو اپنایا جو راست گفتاری کا ہے اور نہ رومانی شعرا کے اس انداز کو جس میں وفورِ جذب،

کثرتِ الفاظ اور مبالغہ روا رکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے نظم و ضبط سے کام لے کر اپنے اظہار و بیان میں گہرائی، توازن اور تہ داری پیدا کی، اور خارجی حقیقت کو تخیل اور احساس کی مدد سے داخلی حقیقت میں تبدیل کر کے پیش کیا۔ فیض کے ہاں عصریت اور آفاقیت سے وہ عصری حسیت پیدا ہوئی جو اس عالمی گاؤں کی ایک مشترکہ صفت ہے جس میں پسے ہوئے طبقے کے دکھوں اور دردوں کو نہ صرف محسوس کیا جاتا ہے بلکہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی جاتی ہے۔

"رقیب سے!"

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے(۵)

فیض کے حوالے سے نقادوں اور دانش وروں نے یہ بحثیں بھی کی ہیں کہ کیا فیض مارکسسٹ تھے یا انسان دوست، یا پھر ان کی شاعری پر مارکسزم کی چھاپ کس حد تک ہے۔ بہر حال فیض ترقی پسند اور پڑھے لکھے شاعر تھے۔ انھوں نے مارکس کے فلسفے کو سمجھا اور اپنے شعور و لاشعور کا حصہ بنایا۔ یہی عصری شعور ہے جو ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ شاعر اپنے باطن کا سفر تو کرتا ہے لیکن جب وہ باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو جو مسائل اسے نظر آتے ہیں، اگر ان مسائل کو اس انداز سے اپنی شاعری میں ڈھال دیتا ہے کہ اس میں آفاقیت پیدا ہو جائے تو یہ شاعر کا کمال ہے۔ فیض کی اسی عصریت اور آفاقیت کی طرف ظفر ادیب نے اشارہ کیا ہے:

> ”ولی سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر اختر شیرانی تک بیان و معنی ان گنت مراحل طے کر چکے ہیں اور کئی منزلوں پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے فیض تک پہنچتے ہیں۔ فیض نے ان میں عصریت اور آفاقیت کے رجحانات ابھارے۔“(٦)

”موضوع سخن“

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسین کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے اس میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ (٧)

فیض اپنے سامنے جس انسان کو دیکھتے ہیں، اس کی کہانی بھوک افلاس اور بیماری میں لتھڑی ہوئی ہے۔ دکھ کو محسوس کرنا اور دوسروں کو محسوس کرانا ہی بڑے شاعر کا کام ہے۔ فیض انسانی دکھوں کو محسوس کرتے ہیں، ان کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ انسان کے ان دکھوں کے مداوے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، فیض کے سامنے جو عالم گیر منظر نامہ تھا اور جو منظر نامہ ان کے ماحول سے متشکل ہوتا تھا، وہ جبر و استحصال کی بدولت مظلومیت کے حوالے سے تھا، وہ خود فریادی بن جاتے ہیں۔ ممتاز حسین اس بارے میں اپنے مضمون ”دل پُرخوں کا ہنر تو دیکھو“ میں لکھتے ہیں:

> ”ان کی شاعری سیاسی دکھ کی ہے نہ کہ سیاسی اقدام کی۔ اس سلسلے میں ان کی تکنیک مظلوم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کی وکالت کرنے کی نہیں ہے۔ بلکہ خود فریادی بن جانے کی ہے۔“(٨)

”سیاسی لیڈر کے نام“

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں

اور شرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے! (۹)

قیام پاکستان سے قبل فیض ایک ترقی پسند دانش ور تھے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے جو خواب ایک عام انسان کے تھے، وہ فیض کے بھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں کے سیاسی نظام اور دیگر مسائل نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب فیض کی سوچ کا ان مسائل سے ٹکراؤ ہوا تو جس شاعری نے جنم لیا، اس کی جرأت پر ہر خاص و عام فریفتہ ہو گیا۔ ڈاکٹر ارشد اویسی فیض کی جرأت اظہار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”فیض ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جہاں جاگیردارانہ کلچر اور ترقی پسند تحریک جیسی روایات مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ فیض کے عشق کی جرأت اظہار نے ہر کٹھن مرحلے سے گزر کر عرض گزاری کی لیکن سماجی تضادات کے جبر کو اور اس کے حوالے سے مصلحت کے تقاضوں کو فیض نے محسوس کیا۔ فیض کی نیم تبسم کی کیفیت اور خیال میں بے نیازی ہر دور میں اپنی مثال آپ رہی۔ فیض اشتراکی روایت کے احترام کو اپنی ذات کا حصہ بنا چکے تھے۔ چناں چہ ان کی جرأت اظہار تخلیقی عمل کا راستہ دریافت کرنے لگی۔“ (۱۰)

فیض کی ”صبح آزادی: اگست ۴۷ء“ ملاحظہ ہو:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی (۱۱)

فیض نے شعور و ادراک کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ شخصی محبت سے آگے بڑھ کر آفاقی محبت اور عالمی برادری کے تصورات کا احاطہ کیا۔ ان کی شخصیت میں پھوٹنے والا جذبۂ عشق، عوامی محبت اور انسان دوستی میں بدلنے لگا۔ محبت کے اس وسیع تر تناظر میں انھیں خاک میں اتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسم نظر آئے جنھیں دیکھ کر وہ کانپ اٹھے۔ ان کے دل میں ظلم و ستم کے مناظر کو دیکھ کر غم و غصہ اور انقلاب کے جذبات

پیدا ہوئے ۔ وہ محبوب کے حسین جلوؤں کو بھول کر زمانے کے دکھوں اور غموں کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ۔ عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی ، سفاک مسیحا اور مدقوق جوانی دیکھ کر وہ چپ نہیں رہ سکے بلکہ وہ مظلوم غریبوں کو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

"بول"
بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے! (۱۴)

فیض ایک حساس، سچے اور مخلص فن کار ہیں ۔ وہ اپنے معاشرے میں طبقاتی نظام کی پیدا کردہ خرابیوں اور الجھنوں کو شدت سے محسوس کرتے رہے ۔ بھوک ، افلاس ، ناداری ، بے بسی اور مظلومیت کے واقعات کا سامنا کرنے پر ان کا وجود لرزہ بر اندام ہوا ۔ لیکن کسی مقام پر بھی وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضامند نہ ہوئے ۔ وہ پسپائی اور شکست خوردگی کے لیے پیدا نہیں ہوئے ۔ ان کی شخصیت میں غیر معمولی توانائی ، اور امید آفرینی ہے ۔ اس کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ زندگی اور معاشرہ تغیر پذیر ہے ۔ خارجی حقیقت تبدیل ہوتی رہتی ہے ۔ اس لیے اگر مظلوم متحد ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف لڑیں تو وہ اپنے حقوق منوا سکتے ہیں اور اپنا تحفظ کر سکتے ہیں ۔ اس کام میں شاعر سماجی ذمہ داری پوری کر سکتا ہے ۔ فیض کے نزدیک شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ظلم و استبداد کا احساس دلائے ، ان کو بیدار کرے اور ان کے دلوں میں عزم و عمل کے جذبات کو جگائے ۔ ایک باشعور فرد کی حیثیت سے شاعر اس سماجی ذمہ داری سے غافل نہیں ہو سکتا ۔ جاپانی بدھ مندروں کے نیچے تہ خانے میں ایک تاریک راستہ ہوتا ہے ، اسے اندھیرے میں پار کرنا ہوتا ہے ، اس کے آخر میں ایک شمع روشن ہوتی ہے ، جو علامتی طور پر امید کی شمع ہوتی ہے ، فیض بھی اس طرح کی اُمید کی شمع روشن کرتے ہیں ۔

"اے دلِ بیتاب ٹھہر!"
تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے

شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبض ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر (۱۳)

شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی غم و الم کی حدود سے نکل کر انسان کی اجتماعی جد و جہد میں شریک ہو۔ اس کے لیے دریا کی لہروں اور موجوں کو گننا اور طوفان کے زور کو محسوس کرنا ہی نہیں بلکہ اس کا رخ نئی اور صحیح سمتوں پر موڑنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ فن کار کا کام یہ ہے کہ طبقاتی کش مکش کا صحیح شعور رکھتا ہو۔ وہ انسان اور سماج کی اجتماعی کاوشوں کا صحیح رخ متعین کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اسے تمام جماعتی رشتوں فرقہ پرستی اور قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر انسان کا ناتا انسان سے جوڑنا ہوتا ہے۔ کائناتی بنیاد پر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانا اور عام انسانی مسرتوں کے لیے کوشاں ہونا بھی اسی کا کام ہے۔ وہ سامراجیت اور ظلم و تشدد کے خلاف ہر آواز کا ساتھ دیتا ہے۔

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں گے، غم بھی نہ رہے گا (۱۴)

فیض کے یہاں اس نظریے کی موجودگی کا احساس بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ فیض نے ایک روشن ضمیر اور حساس فنکار کی طرح بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے جسم و جان کی پوری طاقت سے انسانی فلاح اور بہبود کے لیے کوشاں رہے۔ ملاحظہ ہو "لوح و قلم":

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانی دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے (۱۵)

تاریخی اور سماجی شعور نے فیض کو معاصر زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا عرفان عطا کیا۔ زندگی، سماج، تہذیب اور تاریخ کی متضاد قوتوں کے تصادم اور اس کے نتائج وعواقب کو سمجھنے میں انھوں نے مارکسی نظریے سے بھی استفادہ کیا۔ انھوں نے اشتراکی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا، اور مارکس کے جدلیاتی نظریے کے تحت سماجی زندگی کی کش مکش کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ استحصالی عناصر معصوم اور محنت کش لوگوں کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔

یہ مشاہدات وتاثرات ان کی شاعری کے لیے مواد فراہم کرتے رہے۔ ان کو موضوعات کی کمی کے مسئلہ کا سامنا نہیں رہا۔ انھیں خارجی زندگی میں ہر طرف موضوعات بکھرے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں دیکھیے ''سوچ'':

غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں (۱۶)

فیض کے دور میں جب کہ اس ملک کے لوگ صدیوں کی غلامی، پس ماندگی اور جہالت کے بوجھ تلے دب گئے تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ جابر حکمراں ظلم وستم کے شکنجے کس رہے تھے۔ آزادی اور نجات کی کوئی دوسری صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فیض ایک حساس اور حقیقت شعار فن کار کی طرح اس ذہنی اور جذباتی صورت حال کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ محرومی، بے بسی، اکتاہٹ اور افسردگی کی اس کیفیت کو فن کارانہ خلوص سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ''چند روز اور مری جان!'':

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں پہ دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں (۱۷)

فیض کی شاعری نہ صرف اپنے عہد کی عصری حسیت کی نمائندگی کرتی ہے، بلکہ ان کی شاعری عہد جدید کے عالمی گاؤں کے عصری رجحانات سے بھی جڑی نظر آتی ہے۔ ترقی پسندی کا وہ عمل جو اردو شاعری میں ۱۹۳۶ء میں ایک تحریک کی شکل میں شروع ہوا تھا، وہ چشمہ اور کئی سرچشموں کے ساتھ مل کر ایک بڑے دریا کی صورت اختیار کر چکا ہے، اور فیض کی شاعری اس آبِ رواں میں ایک پھول کی مانند تیرتی نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) فیض احمد فیض، نسخہ ھامے وفا، لاہور: مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، طبع اول، فروری ۱۹۸۴ء، ص ۲۱
(۲) ایضاً، ص ۵۷ (۳) ایضاً، ص ۶۲
(۴) ایضاً، ص ۶۳ (۵) ایضاً، ص ۷۰
(۶) ظفر ادیب، (مضمون) ''نئی کلاسیکیت کے بانی فیض'' مشمولہ فن و شخصیت کا فیض نمبر، مرتبہ سلمیٰ صدیقی، صابردت، بمبئی: ۱۹۸۰ء، ص ۲۴۰
(۷) نسخہ ھامے وفا، ص ۹۱
(۸) ممتاز حسین (مضمون) ''دلِ پُر خوں کا ہنر تو دیکھو'' مشمولہ فن و شخصیت کا فیض نمبر، مرتبہ سلمیٰ صدیقی، صابردت، بمبئی: ۱۹۸۰ء، ص ۵۶
(۹) نسخہ ھامے وفا، ص ۱۱۲
(۱۰) ''فیض احمد فیض اور علامتِ سحر'' ۔ محمد ارشد اویسی/ میمونہ سبحانی، مشمولہ بازیافت، شمارہ ۲۱، جولائی دسمبر ۲۰۱۲ء، لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ص ۴۲
(۱۱) نسخہ ھامے وفا، ص ۱۱۶، ۱۱۸
(۱۲) ایضاً، ص ۸۱ ۔ ۸۲ (۱۳) ایضاً، ص ۱۰۸
(۱۴) ایضاً، ص ۶۶ (۱۵) ایضاً، ص ۱۱۹
(۱۶) ایضاً، ص ۶۵ (۱۷) ایضاً، ص ۷۵

❁❁❁